تدبّرِ قرآن

۷۵

القیٰمۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ بھی، گروپ کی سابق سورتوں کی طرح، انذارِ قیامت کی سورہ ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا ہے کہ اس یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا جو شعور اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے یہ سرگشتگانِ دنیا اس کو ضائع کر بیٹھے ہیں۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں ان کو مزید ہدایت و روشنی نصیب ہوتی ہے اور جو اس کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ ایسے اندھے بہرے بن جاتے ہیں کہ ان پر کوئی تذکیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اس سورہ میں اسی حقیقت کو اچھی طرح مبرہن کر دینے کے لیے نفسِ لوّامہ کی، جو ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور اس کو قیامت کے ثبوت میں ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک مخفی زاجر کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو، جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ انسان کے اندر اس کا پایا جانا نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسؤل بنا کر نہیں چھوڑا گیا کہ چاہے وہ نیکی کرے یا بدی اس کے خالق کو اس سے کچھ بحث نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر اس طرح کے کسی زاجر کو بٹھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کے اندر نفسِ لوّامہ کا پایا جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالمِ اکبر کے اندر بھی ایک نفسِ لوّامہ ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔ وہ ایک دن ظہور میں آئے گی اور ان تمام لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر سرزنش کرے گی جنھوں نے اپنے اندر کے مخفی زاجر کی تنبیہات کی پروا نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی عدالتِ کبریٰ کا ایک عکس ہر انسان کے اپنے وجود کے اندر نفسِ لوّامہ کی عدالتِ صغریٰ کی شکل میں موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص کوئی برائی کرتا ہے وہ کہیں پس پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازے پر اور اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ چنانچہ نفسِ لوّامہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ (۵) (بلکہ انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے) اسی حقیقت کی وضاحت

آگے کی آیات میں یوں فرمائی ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جدید فلسفۂ اخلاق کے ماہروں نے بھی چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر کے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ ان نیکیوں کا نیکی یا ان برائیوں کا برائی ہونا انھوں نے کہاں سے جانا جس کے سبب سے ان کی ساری عمارت بے بنیاد رہ گئی ہے لیکن یہ حقیقت انھیں تسلیم ہے کہ بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے شعور سے انسان محروم نہیں ہے۔ قرآن نے اس سورہ میں اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ صرف نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرمایا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (ضمیر) بھی رکھا ہے جو برائیوں کے ارتکاب پر اس کو سرزنش کرتا اور نیکیوں پر اس کو شاباش دیتا ہے اور پھر اسی نفسیاتی حقیقت پر اس نے قیامت اور جزا و سزا کی دلیل قائم کی ہے کہ جس فاطر نے ہر انسان کے نفس کے اندر اس کی بدعملی پر سرزنش اور اس کی نیکی پر تحسین کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس مجموعی کائنات کے لیے کوئی ایسا دن نہ لائے جس میں اس پوری دنیا کا محاسبہ ہو اور ہر شخص اپنی نیکیوں کا صلہ اور اپنی بدیوں کی سزا پائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۶) قیامت کی قسم خود قیامت کی قطعیت پر اور انسان کے اندر نفسِ لوّامہ کے وجود سے قیامت کے حق میں ایک نفسیاتی شہادت اور اس حقیقت کا انکشاف کہ جو منکرین اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مر کھپ اور گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف ہے۔ ان کی مثال اس بے باک چور کی ہے جو کوتوال کے سامنے چوری کرتا ہے۔

(۷-۱۵) قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب کہ آج تو یہ ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی ہولناک ہلچل برپا ہوگی تو کہیں گے کہ اب کہاں بھاگیں! حالانکہ اس وقت کسی کے لیے خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ہر ایک سے اس دن اس کے ایک ایک عمل کی بابت پرسش ہونی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سے مخفی نہیں ہے اگرچہ وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کتنی ہی سخن سازیاں کریں۔

(۱۶-۱۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد بازی سے اجتناب کی ہدایت اور صبر کی تلقین کہ مخالفین خواہ

کتنی ہی جلدی مچائیں لیکن تم ان سے متاثر ہو کر قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ جس رفتار سے یہ اتر رہا ہے اس کو اطمینان سے اخذ کرو اور لوگوں تک اس کو پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت و مصلحت کے تحت نازل فرما رہا ہے اور اس کے جمع و ترتیب، حفاظت و صیانت اور اس کی توضیح و تبیین ہر چیز کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ ان معاملات میں کسی پہلو سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲۰ - ۲۵) منکرینِ قیامت کو ملامت کہ تمھاری یہ ساری سخن سازیاں کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو خود اپنے ضمیر کے خلاف محض اس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس دنیا کا عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو حالانکہ آخرت ایک حقیقت ہے۔ اس دن بہت سے چہرے شاداب، اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار رہیں گے اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے اور وہ یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنی ہے۔

(۲۶ - ۴۰) کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے گا۔ ہر ایک کو موت کی جان کنی سے سابقہ پیش آنا ہے اور اسی بے بسی و بے کسی کے حال میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔ بدقسمت ہے وہ جس نے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا نہ نماز پڑھی بلکہ جب اس کو یاددہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس خدا نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگون صفات سے اس کو آراستہ کیا اس کے لیے اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتٌ : ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ① وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ② آیات ۱-۲۰
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ③ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى
اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ④ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ⑤
يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ؕ⑥ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ⑦ وَخَسَفَ
الْقَمَرُ ۙ⑧ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ⑨ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ
اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ⑩ كَلَّا لَا وَزَرَ ؕ⑪ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمُسْتَقَرُّ ؕ⑫
يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ ۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ؕ⑬ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى
نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ⑭ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ؕ⑮ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ
لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ⑯ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚۖ⑰ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ
قُرْاٰنَهٗ ۚ⑱ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ⑲ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ⑳
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ؕ㉑ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ㉒ اِلٰى رَبِّهَا
نَاظِرَةٌ ۚ㉓ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ ۢ بَاسِرَةٌ ۙ㉔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا
فَاقِرَةٌ ؕ㉕ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ㉖ وَقِيْلَ مَنْ ۜ سكتة رَاقٍ ۙ㉗

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ
يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ ع ١ ٣٠ ١٧
وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾
ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾
اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ
فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ
ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾ ع ٢ ١٠ ١٨

ترجمہ آیات ١-۴٠

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں روزِ محشر کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی! کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پاویں گے! ہاں، ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اس کے پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ بلکہ انسان اپنے (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے قیامت کب ہو گی؟ ١-٦

پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور سورج گہنا جائے گا اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں! — ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہو گا۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ ٧-١٥

وخسف القمر
قمر کا ترجمہ سورج
لیا گیا ہے

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے

کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔ ۱۶-۱۹

ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔ کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی رحمت کے متوقع اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے، گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ ۲۰-۲۵

ہرگز نہیں، جب کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا! اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۲۶-۳۰

پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے! ۳۱-۳۵

کیا انسان گمان رکھتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا! کیا وہ محض ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہیں تھا! پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی اور اللہ نے اس کا خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے۔ پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ! کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے! ۳۶-۴۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (۱)

قسم سے پہلے 'لا' کے استعمال کی نوعیت

عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جب کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوبِ قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس 'لا' کو زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر سورۂ قیامہ میں اس پر وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کی مراجعت فرمائیے۔

یہاں قسم کا مقسم علیہ مذکور نہیں ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

مقسم علیہ کے حذف کی بلاغت

ایک یہ کہ یہاں مقسم علیہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ سورۂ قٓ اور سورۂ صٓ میں وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ اور وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ کی قسمیں بھی اسی طرح مقسم علیہ کے بغیر آئی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہدِ عدل ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد نفسِ لوامہ کی جو قسم ہے وہ قیامت کے حق ہونے پر ایسی بدیہی دلیل ہے کہ اس کی تکذیب، جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی، آدمی کے خود اپنے قلب و ضمیر کی تکذیب کے ہم معنی ہے۔ اس شہادت کے ہوتے قیامت کسی دلیل کی محتاج نہیں رہ جاتی بلکہ وہ بجائے خود دعویٰ اور دلیل، قسم اور مقسم علیہ دونوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (۲)

نفسِ لوامہ کی شہادت قیامت پر

یہ دوسری قسم ہے اور اس کا مقسم علیہ بھی مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفسِ لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ گویا اس دوسری قسم نے قسم ہی کے پیرایہ میں دعویٰ اور دلیل دونوں کی وضاحت کر دی اور اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قیامت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا عکس ہر انسان کے اپنے باطن کے اندر موجود ہے اور وہ اس کو دیکھتا بھی ہے اگرچہ اس کی تردید میں کتنی ہی دلیل بازیاں کرے۔

‘نفسِ لوّامہ’ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفسِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لیے ضابطہ یہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہو گا۔ سورۂ شمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝	اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل۔
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝	پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝	نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝	فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا
(الشمس-۹۱ : ۷ - ۱۰)	وہ نامراد ہوا۔

اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفسِ امّارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ	اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا۔
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ	نفس بڑا ہی برائی کی راہ سجھانے والا
(یوسف - ۱۲ : ۵۳)	ہے۔

لیکن یہ نفس نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی، اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفسِ لوّامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ لوّامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبّہ ہو کر توبہ و انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنّہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں ‘رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً’

کا مقام حاصل ہوگا جو نفسِ انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر روزِ اول سے ودیعت ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے اس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بروں کے ضمیر کو ٹٹولیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کے لیے ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کے لیے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر ایسا غلبہ پا لیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں، لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنھوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفسِ لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانونِ قدرت نے اس معاشرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

چند سوال اور ان کے جواب

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے بازپرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شترِ بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالتِ کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمالِ خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا

ہوا ہے، وہ شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاد دہانی ہی کے لیے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر اس عالمِ اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ (۳-۴)

حقیقت سے فرار کے لیے منکرینِ قیامت کی سخن سازی

اگرچہ لفظ 'انسان' عام ہے لیکن روئے سخن قریش کے انہی منکرینِ قیامت کی طرف ہے جن کے شبہات پچھلی سورتوں میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان سے اظہارِ بیزاری کے لیے بات عام لفظ سے فرما دی ہے۔ فرمایا کہ قیامت کو ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت تو ہر انسان کے اپنے اندر ہی موجود ہے اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ لوگ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ ان کے مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد ہم ان کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ چیز ان کو بعید از امکان نظر آتی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف قیامت کو جھٹلا رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہم ان کی ہڈیوں کو صرف جمع ہی نہیں کریں گے بلکہ اس قدرت و کمال کے ساتھ جمع کریں گے کہ ان کے جوڑ جوڑ پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ 'بنان' انگلیوں کے پور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر جزو بھی ایسا نہ ہو گا جس کے جمع کرنے اور جوڑنے سے ہم قاصر رہ جائیں۔

'قٰدِرِیْنَ' حال واقع ہے 'نَجْمَعَ' کی ضمیرِ جمع سے۔

بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ (۵)

یعنی قیامت کا انکار اس بنا پر کہ ہڈیوں کو جمع کرنا ان کو بعید از امکان نظر آتا ہے محض حقیقت سے فرار کے لیے سخن سازی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام بن چکے ہیں کہ ان کی پیروی میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے محتسب کے سامنے شرارت کرنا چاہتے ہیں جو کہیں دور نہیں بلکہ خود ان کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی مثال اس چور کی ہے جو کوتوال کی موجودگی میں چوری کرے۔

'اَمَامَهٗ' کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ انسان اپنی آگے کی زندگی میں برابر

اپنے گناہوں پر جما رہنا چاہتا ہے اس وجہ سے قیامت کے انکار کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ مطلب لینے میں نہ نفسِ لوّامہ کی شہادت سے اس کا کوئی تعلق واضح ہوتا اور نہ اس میں انسان پر اس کے اس رویے کے خلاف کوئی حجت ہی قائم ہوتی۔ 'اپنے آگے' سے مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنے نفسِ لوّامہ کے روبرو، اس کی تذکیر و تنبیہ کے علی الرغم، شرارتیں کرنا چاہتا ہے۔ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے نفس کے اندر ہی موجود ہے لیکن جو شخص خود اپنی تردید و تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اس کا کیا علاج ہے!

اس میں دلیل کا پہلو یہ ہے کہ قیامت پر حجت قائم کرنے کے لیے تو انسان کا ضمیر ہی کافی ہے لیکن جو شخص 'دروغ گویم بروئے تو' کی جسارت کرنے پر تلا بیٹھا ہو اس کا منہ نہیں بند کیا جا سکتا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو شخص اپنے نفسِ لوّامہ یا دوسرے لفظوں میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے روبرو برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ضمیر درحقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کا مقرر کردہ محتسب اور قاضی ہے تو جس نے اس کے آگے برائی کی اس نے خدا ہی کے آگے برائی کی۔

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (٦)

ایک احمقانہ مطالبہ اور اس کا معقول جواب

یہ منکرینِ قیامت کی جسارت اور ڈھٹائی کا بیان ہے کہ باوجودیکہ خدا کا محتسب خود ان کے اندر ہی موجود ہے اور وہ اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں لیکن جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ قیامت کہاں ہے؟ وہ کب آئے گی! اگر اس کو آنا ہے تو لا کیوں نہیں جاتی! ہم اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا، نہ آئی تو اب ہم ان ڈراووں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ اس کو لا کر پہلے دکھائیں تو ہم اس کا حق ہونا مانیں گے۔ محض زبانی دھونس سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ (٧-١٠)

یعنی آج تو وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کی تیاری کیے بیٹھے ہیں لیکن جب اس کی ہولناکی سے سابقہ پیش آئے گا تو کہیں گے، اب کہاں بھاگیں؟

قیامت کے دکھا دیے جانے کا مطالبہ چونکہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ ہے اس وجہ سے اس سے تو یہاں تعرض نہیں کیا لیکن اس کی ہولناکی کے بعض پہلو ان کے سامنے رکھ دیے۔ فرمایا کہ اس دن نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، چاند گہنا جائے گا، سورج اور چاند، جو آج اپنے الگ الگ مداروں میں گردش کر رہے ہیں، ان کی حدبندیاں ٹوٹ جائیں گی اور وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

یہ قیامت کے دن کے احوال ہیں جن کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس جہان میں ان کی اصل حقیقت کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ جو دن ایسی ہلچل کا ہوگا کہ چاند اور سورج اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک ہی مدار میں جا پڑیں گے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کا کوئی شائبہ تمھارے اندر ہے تو اس سے پناہ مانگو اور اس کی آفتوں سے بچنے کی جو راہ دکھائی جا رہی ہے اس کو اختیار کرو نہ کہ اس کے لیے جلدی مچاؤ۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہاں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صرف اس کا ہلکا سا تصور دینے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور یہ اس کے بے شمار احوال میں سے صرف چند ہیں۔ آگے اسی گروپ کی سورتوں میں اس کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے اور وہ بھی اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف چند ہی ہوں گے اس لیے کہ زبان ان کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ (۱۱-۱۲)

یہ جواب ہوگا ان کے قول اَیْنَ الْمَفَرُّ کا۔ یعنی وہ پکاریں گے کہ اب کہاں بھاگیں! ان کو جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، اب کوئی ٹھکانا اور بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف سب کا ٹھکانا ہوگا۔ دوسری تمام راہیں فرار کی اس دن بند ہو جائیں گی۔

يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۱۳)

قیامت کی غایت

یہ مقصد بیان ہوا ہے اس دن کے آنے کا۔ فرمایا کہ اس دن ہر شخص کو آگاہ کیا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگاہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس دن اس کے سارے اعمال کے نتائج سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا کی زندگی میں جو بدیاں اس نے کمائیں وہ بھی اس کے سامنے آ جائیں گی اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی سامنے آ جائیں گے۔ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ اس دن آخرت سے غافل رہنے والے اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش! ہم نے آج کے دن کے لیے فلاں اور فلاں کام کر لیے ہوتے اور یہ بھی کہیں گے کہ کاش! ہم نے رسولوں کے انذار سے انحراف نہ کیا ہوتا بلکہ ان کی دعوت پر ایمان لائے ہوتے۔ 'قَدَّمَ' اور 'اَخَّرَ' کے الفاظ ان کے تمام اعمالِ بد اور ان کی ساری کوتاہیوں و کج رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آخرت کی فیروزمندی کے لیے انسان کو بہت سے نیک کام کرنے اور بہت سے برے کام چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت سے غافل یا اس کے منکر ہوتے ہیں وہ ان کاموں سے تو غافل یا منحرف رہتے ہیں جو وہاں کے لیے زادِ راہ کا کام دینے والے ہیں اور جو باتیں آخرت میں تباہی کا باعث بننے والی ہوتی ہیں، ساری زندگی وہ انہی کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے ہی محروموں کے لیے تذکیر و تنبیہ ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ؕ (۱۴-۱۵)

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

یہ اسی بات کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ وہاں مخالفین قیامت کے سوال 'یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ' کے تعلق سے کلام کا رخ تصویرِ قیامت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اصل سلسلۂ کلام پھر عود کر آیا اور بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا کہ انسان قیامت سے گریز کے لیے کتنے ہی بہانے بنائے لیکن وہ اپنے نفس پر خود حجت اور گواہ ہے۔ 'بَصِیْرَةٌ عَلٰی نَفْسِهٖ' کے معنی ہوں گے 'شَاهِدٌ عَلٰی نَفْسِهٖ' (وہ اپنے اوپر خود گواہ ہے)۔ اس کی دلیل اوپر بیان ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر اس کا نفس لوّامہ قیامت کا شاہد ہے، اس کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے آئینے میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

'مَعَاذِیْرُ' جمع ہے 'مَعْذِرَةٌ' کی۔ یہ دراصل 'مَعَاذِرُ' ہے۔ اس میں 'ی' زیادہ ہو گئی ہے جس طرح 'مناکیر' میں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے معنی جھوٹے عذرات اور لاطائل بہانوں کے ہیں۔ عربی میں مثل ہے 'اَلْمَعَاذِرُ مَکَاذِبُ'۔ بعضوں نے اس کو 'معذار' کی جمع بتایا ہے، جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پردے کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہل یمن کی بولی میں نہیں اترا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۱۶-۱۹)

آیات کا پس منظر

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی جلد بازیوں اور ان کے نت نئے مطالبات کے مقابل میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انذارِ عام کی جو بھاری ذمہ داری ڈالی تھی اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کے پاس واحد سہارا وحیِ الٰہی ہی کا سہارا تھا۔ آپ کی شان محاذ پر مامور سپاہی کی تھی اور آپ کوئی بھی قدم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مخالفین آپ کو زچ کرنے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات و مطالبات پیش کر کے آپ کو پسپا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اوپر ان کا ایک مطالبہ مذکور ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اگر اس کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی! اسی طرح قرآن میں ان کا یہ مطالبہ بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو وہ پورا کا پورا بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرض ہر طرف سے آپ پر نئے نئے اعتراضات و سوالات کی بارش تھی اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے لیے آپ کو برابر وحیِ الٰہی کا انتظار رہتا۔ اسی سے آپ کے قلب کو قوت، آپ کی روح کو حیاتِ تازہ، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام

حاصل ہوتا۔ چنانچہ قرآن اور احادیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی حکمتِ الٰہی کے تحت وحی کے نزول اور جبریل امین کی آمد میں کچھ زیادہ وقفہ ہو جاتا تو آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اسی شوق و اضطراب کا اظہار آپ سے اس وقت بھی ہوتا جب جبریل امین آپ پر وحی القا فرماتے۔ آپ ایک پُرشوق طالب کی طرح چاہتے کہ جلد سے جلد ساری وحی سن لیں اور اس کو اچھی طرح محفوظ بھی کر لیں کہ مبادا اس ابرِ نیساں کا کوئی قطرہ ضائع ہو جائے۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آیات پر غور فرمائیے۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت کے شوق و اضطراب کی کیفیت

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عجلت و بے قراری سے روکا گیا ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوتی جب وحی آتی۔ اگرچہ شوق و عجلت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے لیکن اس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہوگی جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامۂ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ناقص ہیں، تاہم ان سے کچھ اندازہ اس شوق، اس عجلت اور اس اضطراب کا کیا جا سکتا ہے جن کا اظہار آپؐ کی طرف سے بے اختیارانہ اس وقت ہوتا رہا ہوگا جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔

اس کا سبب کوئی ایک نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متعدد تھے۔ مثلاً

- یہ کہ آپ جس فریضۂ منصبی پر مامور تھے اس کا سارا پروگرام اسی سے معلوم ہوتا تھا۔
- آپ کی عقلی، ایمانی اور روحانی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔
- حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رہنمائی اسی سے ملتی تھی۔
- دشمنوں کے نت نئے اعتراضات و مطالبات کے فیصلہ کن جوابات اسی کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے۔
- علم کا غیر معمولی شوق اور اس کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔

ان میں سے ہر محرک ایک پاکیزہ محرک ہے لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن جس تدریج سے نازل ہو رہا ہے اسی طرح نازل ہو۔ چنانچہ آپ کو بار بار اس معاملے میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۱۴-۱۱۵ میں بھی آپ کو اسی طرح کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً اسی بات کا ذکر ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے آپ کو یہ اطمینان بھی، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو رہا ہے، یہاں دلا دیا گیا کہ آپ قرآن کی حفاظت و صیانت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ اس کے جمع و ترتیب، اس کو سنانے، یاد کرانے اور اس کے محتاجِ وضاحت مقامات کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ جتنا جتنا قرآن اترتا جائے اس پر آپ قناعت کریں۔ نہ اس کے اتارے جانے کے لیے کسی عجلت و اضطراب کا اظہار کریں، نہ اس کی حفاظت کے باب میں کسی تشویش میں مبتلا ہوں۔ ان باتوں کو اپنے رب پر چھوڑیں۔ ہر کام اپنے صحیح وقت پر، ٹھیک اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

’اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَقُرۡاٰنَہٗ‘ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشویش کو رفع فرمایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ چونکہ ایک عظیم آسمانی خزانہ آپ کی تحویل میں دیا جا رہا تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کو اپنی امانت میں لیتے ہوئے آپ ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ کرنے کی کوشش کرتے کہ کوئی حرف ضائع نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سنانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

قرآن کے جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت کا وعدہ

لفظ ’جمع‘ یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کی تعیین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

اس کے علاوہ مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا، اسی کی طرف ’قُرۡاٰنَہٗ‘ کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

’فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ‘ یعنی تم اپنی طرف سے قرآن کے اتارے جانے کے لیے کوئی جلدی نہ کرو۔ یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑ دو۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جتنا چاہے گا نازل فرمائے گا اور اس کی حفاظت اور اس کے جمع و ترتیب کا اہتمام بھی فرمائے گا۔ تمہاری ذمہ داری

صرف یہ ہے کہ ہم جتنا قرآن سنا چکیں اس کے سنانے کی پیروی کرو۔ اسی کو پڑھو، اسی پر عمل کرو اور اسی کی دعوت دو۔ جو لوگ پورے قرآن کو یک دفعہ نازل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے مطالبہ کی کوئی پروا نہ کرو۔

'ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ' اسی سلسلہ میں مزید اطمینان یہ بھی دلا دیا کہ اگر قرآن کے کسی مقام میں کسی وضاحت کی ضرورت ہوگی تو اس کے باب میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے۔ جب وقت آئے گا تو یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو کسی سابق حکم کی توضیح و تبیین یا اس کے نسخ یا تکمیل کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان توضیحی آیات کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ان کے بعد بالعموم 'کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ' کے الفاظ سے قرآن نے یہ رہنمائی بھی دے دی ہے کہ یہ اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے 'اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ' کے الفاظ میں فرمایا ہے۔

استاذ امامؒ کے بعض افادات

ان آیات کے تحت استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصے بھی ہم نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات میں جس عجلت کا ذکر ہے اس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جا رہی ہے، اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی یا اس کا ایک حرف بھی ضائع ہوا تو آپ کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپ کو یہ تمنا بھی تھی کہ اس میں اضافہ ہو، شاید آپ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاملے کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ اس سورہ میں آپ کو جو تسلی دی گئی اس میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔"

"قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح فرمایا ہے مثلاً

وَاِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ
(حٰمٓ السجدة - ۴۱ : ۴۱-۴۲)

اور یہ کتاب عزیز ہے جس میں باطل نہ اس کے آگے سے راہ پا سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے

دوسرے مقام میں ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

ہم ہی نے اس یاددہانی کو نازل کیا ہے

(الحجر - ۱۵: ۹) اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ یہ باتیں اس وعدۂ حفاظت کے منافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیتوں میں فرمایا ہے۔ چنانچہ اس امر پر پوری امت متفق ہے کہ قرآن بالکل محفوظ ہے! امامیہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی، سب نے اس بے ہودہ خیال کی، پوری شدت کے ساتھ، تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہٖ وہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن ایک حرف بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص ہم سے یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔ اس باب میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے بارے میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کا تمام تر مدار چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات کا انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت سے ثابت ہے۔"

آیت زیر بحث سے مولانا علیہ الرحمۃ نے جو استنباط کیے ہیں وہ یہ ہیں:

- "قرآن حضورؐ کی زندگی ہی میں جمع کر کے، ایک خاص ترتیب پر آپ کو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ دیا گیا ہے "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)۔

آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے اسی طرح آپ اس کو پڑھیں۔۔۔۔۔۔ اس حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس پر اس کی آخری قرارت ہوئی۔ اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے۔ آخری قراءت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔

- یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل کی نوعیت کی تھیں۔"

آگے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپ کو سنائی گئی ہوں۔ صحابہؓ اسی ترتیب پر قرآن سنتے تھے اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ آیتوں کو مخصوص سورتوں میں، معیّن مقامات پر لکھواتے، اور صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کرتے۔ پھر جب کوئی توضیحی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں اس کے معیّن مقام میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے: یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملا دی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔"

"ان توضیحی آیات کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے تدبّر سے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیات کے اندر ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ توضیح و تشریح کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ بالعموم اس طرح کے الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ' (اس طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول رہا ہے)۔"

اسی طرح یہ بات بھی صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ آخر میں حضرت جبریلؑ نے پورا قرآن، اس کی اصلی ترتیب کے مطابق آپ کو سنایا۔ اس سے نظم قرآن کے باب میں بہت سے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔"[1]

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۲۰-۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے جڑ گیا۔ مکذبینِ قیامت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قیامت کے بارے میں تمھارا یہ رویہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کی کوئی دلیل تمھارے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت تو خود تمھارے اپنے قلب و ضمیر ہی کے اندر موجود ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا اور اس کی مرغوبات سے عشق رکھتے ہو اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ تمھارے اندر نہیں ہے۔

تکذیب قیامت کی اصل علت

'تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ' کے معنی ہیں 'آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو'۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت تم سے مخفی نہیں ہے لیکن دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں ہے اس وجہ سے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رہے ہو۔

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۙ
تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ؕ (۲۲-۲۵)

اصل حقیقت

یعنی دنیا کے پیچھے آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو تو کرو لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ جس کو نظر انداز کر رہے ہو وہ آ کے رہے گی اور اس دن صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔ جنھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزاری ہوگی ان کے چہرے تو اس دن تر و تازہ اور شاداب ہوں گے، وہ اپنے رب کی رحمتوں کے متوقع ہوں گے اور جنھوں نے اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزاری ہوگی ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے اور وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

یہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کے حالات کی تصویر ہے۔ متقین جنت جب دیکھیں گے کہ ہر قدم پر ملائکہ سلام و تحیت اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں تو اپنے روشن مستقبل کے تصور سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ متوقع ہوں گے کہ اب رب کریم کی اس کامل رحمت و عنایت کے ظہور کا وقت آگیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس کفار کے ساتھ قدم قدم پر جس طرح کا معاملہ ہوگا اس سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ کہ اب اس کمر توڑ دینے والی مصیبت سے دوچار ہونے کا وقت آگیا جس سے ان کو آگاہ کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو نظر انداز کیے رکھا۔

اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کا صحیح مفہوم

'اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ' کے معنی ہیں وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔ 'نَظَرَ' کے بعد جب 'اِلٰی' کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ ماہرین لغت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے، جس سے اس کو عنایت کی توقع ہو، یہ کہے کہ 'اِنَّمَا نَنْظُرُ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ اِلَیْكَ' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے بعد آپ کی عنایت کے متوقع ہیں[1]۔

کلام کا سیاق و سباق بھی یہاں اسی معنی کے حق میں ہے۔ دوزخ میں جانے والوں کی ذہنی حالت و کیفیت 'تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے یعنی وہ حالات دیکھ کر یہ گمان کر لیں گے کہ اب ایک کمر توڑ دینے والی مصیبت ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ اور اس گمان کے سبب سے ان کے چہروں پر بدحواسی طاری ہوگی۔ ان کے اس گمان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے رب کی سب سے بڑی رحمت کے ظہور کے متوقع ہوں گے اور اس توقع کے سبب سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے۔

---

[1] اقرب الموارد

'اَنْ یُّفْعَلَ بِھَا فَاقِرَۃٌ' کی تالیف زمخشریؒ نے یوں بیان کی ہے: 'ای یفعل بھا فعل ھو فی شدتہا فاقرۃ' (یعنی اس کو ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت کمر توڑ دینے والی ہے)۔ اگرچہ اس کے سوا بھی اس کی تالیف کی بعض صورتیں ممکن ہیں لیکن میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی بعض مثالیں آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔

'فَاقِرَۃٌ' ایسی مصیبت کو کہتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑ دینے والی ہو۔

رویتِ باری کے مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر

'اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ' سے بعض لوگوں نے رویتِ باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک' جیسا کہ اس کی تاویل اور اس کے موقع و محل سے واضح ہے، یہ آیت اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے: بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویتِ باری تعالیٰ کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں 'اِلٰی' کے معنی ہی بدل دیے ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ رویتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان، ایمان بالغیب ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا ایمان بالمشاہدۃ ہوگا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس مشاہدہ کی نوعیت کیا ہوگی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے اور متشابہات میں تعمق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہی جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہوگی؟

کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۙ وَقِیْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۙ وَّظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ (۲۶ - ۳۰)

عیشِ دنیا کے متوالوں کو موت اور آخرت کی یاددہانی

عیشِ دنیا کے متوالوں کو یہ موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بےلبسی کی یاددہانی ہے کہ قیامت کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ وہ لازماً آئے گی اور تمھیں خدا کی طرف اس دن سفر کرنا ہوگا جب تمھاری ساری جولانیاں ختم ہو جائیں گی اور بےبسی کا یہ حال ہوگا کہ پنڈلی سے پنڈلی لپٹی ہوئی ہوگی۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ کے رہ جائے خدا کی طرف بھاگو اور اس سفر کے لیے کچھ سامان کر لو۔

فراہیؒ کے چند نکات

ان آیات کے تحت استاذ امام علیہ الرحمۃ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی تفسیر سے ہم اس کا ضروری خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

'بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ' میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو یہاں محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۂ واقعہ میں بھی ہے۔ فرمایا ہے: 'فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ' (الواقعۃ - ۵۶ : ۸۳) (کیوں نہیں جب کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے!) اس طرح کا حذف عربی میں معروف ہے اس وجہ سے 'نفس' کا ذکر

ضروری نہیں ہوا۔ کلامِ عرب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتی   اذا حشرجت یومًا وضاق بہا الصدر

(اے ماویہ! مال آدمی کے کیا کام آئے گا جب جان سینے میں پھنسے گی)

اس میں 'حشرجت' کا فاعل نفس ہے لیکن اسی قاعدے کے مطابق جو مذکور ہوا اس کو حذف کردیا۔ قرآن مجید میں بھی اس حذف کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (فاطر۔ ۴۵) (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑتا) اس میں دیکھ لیجیے ضمیر کا مرجع 'الارض' ہے جو محذوف ہے۔ ....

'وَقِیْلَ مَنْ سکتۃ رَاقٍ' (اور پکاریں گے، ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!) یہ فقرہ صورتِ حال کی شدت و نزاکت کی تعبیر کے لیے ہے اور مجہول کا صیغہ یہاں غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہوگا کہ کوئی شخص قائل کی طرف توجہ کرنے والا نہیں ہوگا، یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی ذات سے بالکل بے پروا کردے گی۔ ہر شخص کی زبان پر بس یہی کلمہ ہوگا۔ نکرہ سے پہلے 'مَنْ' یا تو شدتِ طلب کے لیے آتا ہے یا غلبۂ یاس کی تعبیر کے لیے۔ طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی   عنیت فلم اکسل ولم ابتلد

(جب قوم پکارتی ہے کہ ہے کوئی جوان! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، پھر میں کسی سستی اور بودے پن کا اظہار نہیں کرتا)۔

....

اب دیکھیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں میں فرق محض ظاہری ہے۔

پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہوگی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیماردار گھبرا کر پکاریں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا جو اس جاں بلب کا علاج کرے!

دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا! اب کون اس کو شفا دے سکتا ہے! یہ اظہارِ یاس کا فقرہ ہے اور یہ سن کر مریض کو یقین ہو جائے گا کہ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مشہور شاعر خنساء نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

لکن سہام المنایا من یصبن لہ   لم یشفہ طب ذی طب ولا راق

(جس کو موت کے تیرآزدہ ہو گئے اس کو نہ کسی طبیب کی حذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک

والے کی جھاڑ پھونک؟

یہ دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ ہم نے دونوں سامنے رکھ دی ہیں۔ جو چاہو اختیار کر سکتے ہو لیکن ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظمِ کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔"

'وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ' کی وضاحت کرتے ہوئے مولاناؒ لکھتے ہیں:

"پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ یہ حالت شدتِ ضعف و بے بسی کے سبب سے ہوگی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور رہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں باہم دگر لپٹ گئی ہیں۔ . . .

. . . .

ضعف و بے بسی کی تعبیر کے لیے التفاق ساق (پنڈلی کا لپٹ جانا) نہایت موزوں تعبیر ہے۔ مدعا کلام کا یہ ہے کہ جب معالج مریض سے مایوس، اعزہ و اقربا دست بردار، فرمانبردار اعضاء قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اس کو رب کی طرف جانا ہوگا، سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا، تو اس وقت اس کا کیا حال ہوگا؟

بعض لوگوں نے 'ساق' کے معنی 'شدت امر' کے لیے ہیں۔ لیکن یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو عربی زبان سے کوئی مس نہیں ہے۔ یہ لوگ اجزاء اور مجموعہ کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ 'کشف عن الساق' اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں معروف ہے مگر جب یہ دونوں لفظ الگ الگ آئیں گے تو 'کشف' کے معنی کھولنے اور 'ساق' کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ 'ساق' سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کو کچھ وہم ہوا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیانِ واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ 'ساق' کی تفسیر۔

پنڈلی لپٹنے کا ٹھیک مطلب سمجھ لینے کے بعد 'اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ' (اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوگا) کا حسنِ موقع آپ سے آپ سمجھ میں آجاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوئی ہے یہ اس پر اس کو سرزنش ہے کہ وہ برابر دنیا ہی کی طلب میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ اسی تگ و دو میں اس کی تمام طاقت نچڑ گئی اور اس کو جانا ہے اپنے رب کے پاس تو وہ یہ سفر کس طرح طے کرے گا!"[1]

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۙ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ؕ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۙ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی (۳۱-۳۵)

سفر دشوار اور زاد و راحلہ کچھ نہیں

یہ ان مکذبین آخرت کی محرومی کا بیان ہے کہ سفر تو ان کو اتنا کٹھن درپیش ہے لیکن زاد و راحلہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے خدا کی راہ میں انفاق کیا نہ نماز پڑھی درآنحالیکہ یہی دو چیزیں اس سفر میں کام آنے والی تھیں۔

'صَدَّقَ' کے بعد 'بِالْحُسْنٰی' کا لفظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ سورۂ لیل میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے: 'فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی' (الیل - ۹۲: ۵-۷) (پس جس نے اپنا مال راہِ خدا میں دیا اور اپنے رب سے ڈرا اور آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی تو اس کو ہم سہج راہ چلائیں گے) یہ امر واضح رہے کہ خدا کی راہ میں انفاق ان لوگوں کے لیے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جو آخرت اور اس کی جزائے حسن کے قائل نہ ہوں۔ یہ گھاٹی وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جن کے دل مطمئن ہوں کہ دنیا میں جو کچھ وہ خرچ کریں گے آخرت میں ایک لازوال خزانہ کی صورت میں وہ ان کو ملنے والا ہے۔ آخرت کی جزا کا اعتقاد ہی ہے جو آدمی میں انفاق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جو اس کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں ان کی مٹھی انفاق کے لیے کبھی نہیں کھلتی۔ سورۂ لیل کی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس طرح واضح فرمائی گئی ہے: 'وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۙ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی' (الیل ۹۲: ۸-۱۰) (رہا وہ جس نے بخیلی کی اور بے پروا ہوا اور جزائے حسن کی تکذیب کی تو ہم اس کو ایک کٹھن راہ چلائیں گے)۔

ان آیات کی روشنی میں 'فَلَا صَدَّقَ' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس نے نہ آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی اور نہ اپنے رب کی راہ میں خرچ کیا۔ گویا اس لفظ کے اندر تکذیب آخرت اور بخالت دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ 'وَلَا صَلّٰی' (اور نہ اس نے نماز پڑھی) گویا انفاق اور نماز دونوں کا اصل محرک جزائے اعمال کا اعتقاد ہے اور جب یہ اعتقاد ہی معدوم ہے تو ان کے وجود پذیر ہونے کا کیا امکان باقی رہا۔

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہوتی آ رہی ہے کہ نماز اور انفاق ہی دین کے وہ بنیادی اعمال ہیں جن پر پوری شریعت قائم ہے۔ اب اس آیت سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ ان دونوں کا انحصار آدمی کے عقیدۂ آخرت پر ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ محکم نہ ہوگا وہ ان کا اہتمام نہیں کر سکتے۔

'وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی'۔ 'کَذَّبَ' یہاں 'صَدَّقَ' کے مقابل میں اور 'تَوَلّٰی' یہاں 'صَلّٰی' کے بالمقابل ہے۔ یعنی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ رسول اور آخرت کی تصدیق کرتا اور خدا کی راہ میں انفاق کرتا۔

اور نماز پڑھتا لیکن اس نے تکذیب اور اعراض کی روش اختیار کی۔

اعراض کی تصویر اور اس کا سبب

’ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى‘: یہ اس اعراض کی تصویر بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس کا سبب بھی بیان ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر مال و اولاد کا گھمنڈ ہوتا ہے ان کو خدا اور آخرت سے ڈرایا جائے تو یہ تذکیر ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی رفاہیت و جمعیت کو اپنی روش کے صحیح اور کامیاب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان لوگوں کی نصیحتیں خاطر میں نہیں لاتے جو ان کی روش میں کسی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اکڑتے ہوئے اپنے اہل و عیال کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہے تو یہ ہماری اقبال مندی کی دلیل ہوئی یا خرابی کی! خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ انھیں لوگوں کے دماغوں کے اندر ہے جو خود تو ہر چیز سے محروم ہیں لیکن ہمیں ڈراوے سنا رہے ہیں کہ ہم تباہی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں، مختلف اسلوبوں سے، بار بار بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اندر برابر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں کہ مبادا اس گلے کی نگہبانی کا حق ادا نہ ہو سکے اور وہ خدا کی کسی پکڑ میں آجائیں۔ اہل ایمان کے اس احساس ذمہ داری کا اظہار قرآن میں یوں ہوا ہے: ’اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ‘ (الطور - ۵۲ : ۲۶) (ہم پہلے سے اپنے اہل و عیال کے باب میں ڈرتے رہے ہیں) اس کے بالکل برعکس رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و نازش اور ان کو اپنی اقبال مندی کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کے دماغ پر وہی نشہ سوار ہوتا ہے جو سورۂ کہف میں ایک باغ والے کے قصہ میں بیان ہوا ہے کہ ’مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا‘ (الکہف - ۱۸ : ۳۵) (میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا) اسی طرح کے لوگوں کی ذہنیت سورۂ مطففین میں بدیں الفاظ بیان ہوئی ہے: ’وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ‘ (المطففین - ۸۳ : ۳۱) (اور جب وہ اپنے اہل کی طرف لوٹتے ہیں تو مگن ہو کر لوٹتے ہیں)۔

’اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى‘: ’اَوْلٰى‘ لفظ ’وَیْل‘ سے ہے جو زجر، اظہار حسرت، ملامت اور اظہار نفرت و غضب کے لیے آتا ہے۔ اس معنی میں یہ کلام عرب میں بکثرت آیا ہے۔ خنساء کا مشہور شعر ہے:

هممت بنفسی کل الهموم   فَاَولیٰ لنفسی اَولیٰ لها

(میں نے اپنے نفس کے بارے میں طرح طرح کے ارادے کر ڈالے۔ پس افسوس ہے میرے نفس پر، افسوس ہے!)

معلوم نہیں بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ سزاوار کس طرح کر دیا ہے۔ یہ عربیت کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق سے بھی بے جوڑ ہے۔

اوپر سے کلام غائب کے اسلوب میں آ رہا تھا، اس آیت میں اسلوب خطاب کا آ گیا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی افسوس اور نفرت کے اظہار میں شدت پر دلیل ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ۝ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۝ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی ۝ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی (۳۶-۴۰)

جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

اب اسی مضمون پر سورہ کو ختم فرمایا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ شروع میں فرمایا ہے: اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ۔ اس کے بعد کلام انسان کی خودسری، دیدہ و دانستہ حق پوشی اور ہولِ قیامت کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب آخر میں اسی سوال کو لے کر اس کا جواب دیا کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا! اگر غیر مسئول چھوڑ دیا جانا خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے منافی ہے تو خدا کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ کیا وہ خود اپنی خلقت کے مراحل پر غور نہیں کرتے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو رحم میں ٹپکا دی جاتی ہے۔ 'یُمۡنٰی'، مجہول کا صیغہ عدم اعتنا و اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ٹپکا دینے والا ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتا ہے، پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں اور کس حال میں ہے۔ بعد کے سارے تصرفات اس پر قدرت کرتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے اس کو مختلف مراحل سے گزارتی ہے۔ پانی کی بوند خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے جاتے ہیں۔ بالآخر قدرت اس کو مرد یا عورت بنا کر وجود میں لاتی ہے۔ ان تمام مراحل میں قدرت کا مو قلم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے۔ کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے اپنی قدرت، حکمت اور صنعت گری کی یہ شانیں تمھارے وجود کے اندر تمھیں مشاہدہ کرائی ہیں کیا وہ تمھارے مر جانے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہو گا!

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

ولله الحمد فی الدنیا والاٰخرۃ۔

رحمان آباد
۱۹ر جنوری ۱۹۷۹ء
۱۹ر صفر ۱۳۹۹ھ